انسانی نفس کی بنیادی خرابیوں کی نشاندہی

جدید دور کا سب سے بڑا بحران، جس میں ہم میں سے تقریبا ہر فرد کسی نہ کسی طرح مبتلا ہے، وہ ذہنی دباؤ کا بحران ہے اور افراد کا ایک دوسرے سے شاکی ہونے، مشتعل ہونے اور خوداعتمادی اور ذہنی وقلبی وسکون سے محروم ہونے کا بحران ہے۔ دانشور ہو یا جاہل، امیر ہو یا غریب، سرمائیدار ہویا مزدور، آفیسر ہو یا کلارک، لیڈر اور قائد ہویا کارکن، لگ بھگ ہر فرد اس بحران کی لپیٹ میں ہے، اگر افراد معاشرہ کی اس حالتِ زار کے علاج کی فکر نہ کی گئی تو شدید خطرہ ہے کہ کہیں ہمارا معاشرہ بھی مغربی معاشروں کی طرح نفسیاتی مریضوں کے معاشرہ میں تبدیل نہ ہوجائے۔

دراصل معاشرہ کا یہ سارا فساد انسانی نفس کی کارستانیوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی ہے، انسانی نفس جن جذبات ومیلانات سے عبارت ہے، ضرورت ہے کہ ان جذبات ومیلانات کو سمجھکر ان جذبات کو مہذب بنانے کی کوشش کی جائے، یہ ضرورت اس لئے بھی ہے کہ نفسی قوتوں کے عدم فہم کی وجہ سے معاشرہ میں انتشار، تصادم اور ایک دوسرے سے ٹکراؤ کی فضا تیزی سے بڑھتی جائے گی اور بیوی کا شوہر سے ٹکراؤ، اولاد کا والدین سے ٹکراؤ، شاگردوں کا اساتذہ سے ٹکراؤ، مولوی کا مولوی سے ٹکراؤ، سیاستدانوں کا دوسرے اہل سیاست سے ٹکراؤ ، ایک ہی دفتر میں کام کرنے والے افسران کا ایک دوسرے سے ٹکراؤ ، دینی ومذہبی جماعتوں کے کارکنوں کا ایک دوسرے سے ٹکراؤ اور ایک ہی درسگاہ میں پڑھنے والے طلبہ کا باہمی ٹکراؤ مسلسل بڑھتا ہی جائے گا۔

مسئلہ کی اس سنگین اہمیت کے پیش نظر ہم مختصرا انسانی نفس کی ''خصوصیات'' یعنی خرابیوں پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

انسانی نفس کی ایک ''خصوصیت'' یعنی خرابی یہ ہے کہ وہ اپنی ذات ہی کو محبوب رکھتا ہے، دوسروں کے ساتھ اس کے تعلق کا پیمانہ یہی ہے کہ وہ ان کے نفسی مفادات کی تکمیل میں کس حد تک معاون ہیں، اگر معاون نہیں ہیں تو اس کا ان سے کوئی تعلق نہیں، چاہے وہ مرے یا جیئے، نفس کی یہ خرابی ایسی ہے، جس کا اس کی طرف سے زندگی کے ہر موڑ پر مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔

نفس کی دوسری ''خصوصیت'' یعنی خرابی یہ ہے کہ اسے اپنے عیب اور نقائص نظر نہیں آتے، اسے ہر وقت دوسروں کے عیوب کی تلاش رہتی ہے اور وہ دوسروں کی تنقیص تردید اور ان کی خرابیوں اور عیب جوئی میں مصروف رہتا ہے، بالخصوص اپنے ساتھ اختلاف رکھنے والوں سے وہ شدید کدورت رکھتا ہے۔ اس کی کوئی مجلس ایسی نہیں ہوتی، جس میں وہ اپنے حلقہ احباب اور عزیز واقارب کے عیوب کو افشاں کرنے کے لئے کوشاں نہ ہو۔

انسانی نفس کی تیسری ''خصوصیت'' یہ ہے کہ وہ گھر سے لے کر دفتر، بازار اور دوستوں وساتھیوں سب میں ممتاز بن کر رہنا چاہتا ہے۔ اس کی ہمہ وقت یہی آرزو رہتی ہے کہ دوسرے اس کی عزت وتکریم کریں اور اس کے امتیازی شان کو کسی بھی طرح مجروح نہ کریں اور اسے ممتاز حیثیت دیں، اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ یا تو احساس کمتری کا شکار ہوجاتا ہے یا ایسا نہ کرنے والوں کے بارے میں اس کا دل میلہ ہوجاتا ہے۔ نیز اس سے وہ سخت رنجیدہ اورغم زدہ ہوجاتا ہے۔

انسانی نفس کی چوتھی ''خصوصیت'' یعنی خرابی یہ ہے کہ وہ خودنمائی اور جذبہ شہرت کا حریص ہے۔ وہ اپنی تعریف وتوصیف سننے کا مشتاق رہتا ہے، ناکردہ کاموں کے بارے میں بھی اس کی تمنا ہوتی ہے کہ دوسرے اسے سراہیں اور اسے داد دیں۔ جب اس کی تعریف ہوتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے، اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ اپنے ساتھیوں سے دلی طور پر رنجیدہ ہونے لگتا ہے۔ اگرچہ وہ بظاہر اس کا اظہار نہ کر سکے۔

انسانی نفس کی پانچویں ''خصوصیت'' یہ ہے کہ اس کا دل ہر وقت دولت میں اٹکا رہتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دولت کمانا اور دولت کے انبار جمع کرتے رہنا، گویا اس کے مقاصد زندگی میں شامل ہوجاتا ہے، دولت کے سلسلہ میں اس کی ہوس کسی بھی حد پر آ کر رکنے نہیں پاتی۔ ہر شخص مالدار سے مالدار تر بننے کی حسرت میں رہتا ہے اور اس کے لئے توانائیوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ ہر طرح کے ذرائع بھی استعمال کرتا ہے۔

انسانی نفس کی چھٹی ''خصوصیت'' یعنی خرابی یہ ہے کہ وہ مادی حسن پر فریفتہ رہتا ہے، حسین تصویروں کو دیکھنا، جنسی لذت سے آخر حد تک متمتع ہوتے رہنا، عورتوں کا حسین مردوں کو دیکھتے رہنے کی آرزوؤں کا ہونا اور مردوں کا حسین عورتوں کو دیکھنے کی اضطراب کی حد تک آرزوؤں کا ہونا ہے۔

انسانی نفس کی ساتویں ''خصوصیت'' یہ ہے کہ وہ اپنے عزیز واقارب دوست واحباب اور جماعتی ساتھیوں کو معاشی ومعاشرتی سرگرمیوں میں آگے بڑھنے اور قیادت وسیادت کے مقام پر فائز ہوتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتا۔ جب اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی تو وہ حسد اور جلن کا شکار ہوجاتا ہے۔

ہمارے معاشرہ میں جب تک نفس کی ان خرابیوں کا کسی حد تک ادراک موجود تھا، تب تک ہمارا معاشرہ ہمہ گیرو ہمہ جہتی فساد سے محفوظ تھا اور ہمارے گھروں اور معاشرتی زندگی میں کسی حد تک خیروبرکت موجود تھی اور محبت ورواداری کی تھوڑی بہت فضا موجود تھی، لیکن اب چونکہ تعلیمی اداروں اور الیکٹرانک میڈیا کے طاقتور ذرائع نے نفس پرستی کی ان قوتوں کا ادراک اور شعور سلب کردیا ہے اور ہر شخص اپنے آپ کو آزاد، خودمختیار بلکہ دانشور سمجھنے لگا ہے، اس لئے افراد کی ان نفسی خرابیوں نے قیامت سے پہلے قیامت برپا کردی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان مادہ اور روح دونوں سے عبارت ہے۔ مادی نفس، فرد کو ہر وقت مادہ (یعنی دنیاوی مفادات) پر فنا ہونے کے لئے اکساتا رہتا ہے، جب کہ انسانی روح فرد کو مادہ سے بلند ہوکر، محبوب حقیقی کے انوار حسن سے متمتع ہونے اور اس کے اخلاق کو اختیار کرنے کے لئے ابھارتا رہتا ہے۔ اب مادہ پرستی کی عالمگیر فضا نے افراد میں نفس اور روح کے درمیاں اس کشمکش کو بھی بڑی حد تک مضمحل کردیا ہے، جس کی وجہ سے مادی نفس کی خرابیاں عروج پر ہیں۔

انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد اگر مختصر لفظوں میں بیان کرنے کے لئے کہا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی شخصیت میں موجود محبوب حقیقی کے ساتھ محبت کے جذبات (جسے تعلیم وتربیت کا نظام اور مادی ماحول دبا دیتا ہے) اسے بیدار کرکے، اللہ کی اطاعت کے ذریعہ اسے ارتقائی صورت دینا ہے۔ چونکہ انسانی روح، محبوب حقیقی کے لئے بے تاب رہتا ہے، اس لئے اگر روح کے ان تقاضوں کو شروع ہی سے بیدار کرنے کی طرف توجہ دی جائے تو مادہ کی سرکش قوتوں کا آسانی سے مقابلہ ہوسکتا ہے۔

موجودہ دور میں اصلاح کا درد رکھنے والے بیشتر افراد، معاشرہ کی صورتحال میں بہتری کے لئے حکومت اور حکومتی اداروں کی طرف تکتے رہتے ہیں، یا ان کی کوشش کا ہدف یہی ہوتا ہے کہ انسانوں کے اندر موجود ہولناک خرابیوں کی اصلاح کے بغیر حکومتی اداروں میں انقلاب برپا ہوجائے، اس طریقہ حکمت نے بھی افراد کی اصلاح کے کام کو دشوار بنادیا ہے، اس طرح افراد معاشرہ کی اصلاح کا عمل متاثر رہا ہے۔ عالمی باطل ہو یا مقامی نوعیت کا باطل، وہ نفس ہی کا پیداوار ہے۔ نفس کی اصلاح کے لئے لائحہ عمل طے کئے بغیر نہ تو عالمی باطل سے مقابلہ کی صورت پیدا ہوسکتی ہے، نہ مقامی باطل سے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے مسلمان وہ ہے، جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ ہو، اس طرح کے آپ کے بیسیوں فرمان ہیں۔ ان فرمانوں کی روشنی میں ہم اگر اپنے کردار کا جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ نفس کی جن خرابیوں کا اوپر ذکر ہوا، وہ خرابیاں کم وبیش سب ہم میں موجود ہیں۔

ہم نے نفس کے جس طاقتور بت کدہ اور خرابیوں کے مرکز کی نشاندہی کی ہے، یہ نشاندہی دراصل قرآن وسنت ہی سے ماخوذ ہے۔ اس سلسلہ میں نمونۃ دوتین آیات واحادیث پیش کی جاتی ہیں۔

وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِيْ الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللّهِ . (اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کے راستہ پر چلوگے جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے)۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّهِ مِن وَلِيٍّ وَلاَ وَاق. (اور اگر آپ ان کی نفسانی خواہشات کا اتباع کرنے لگیں بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے تو اللہ سے مقابلہ میں نہ کوئی آپ کا مددگار ہوگا نہ بچانے والا)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں نفس سے جہاد کرے۔ ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا، تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے جو

تیرے دونوں پہلوؤں کے درمیاں میں ہے۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ ہر دور کے انبیاء کرام کی مخالفت میں افراد کی نفسی قوتوں اور نفسی جذبات نے ہی منفی کردار ادا کیا ہے۔فرعونیوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْماً وَعُلُوّاً . (انہوں نے ظلم وتکبر کی وجہ سے حق کا انکار کیا حالانکہ ان کے دل اسے مان چکے تھے۔)

اہل کتاب کے بارے میں قرآن فرماتا ہے۔

وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيراً مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَاناً وَكُفْرا. (اپنے رب کی طرف سے آپ پر قرآن کی آیتوں کا جو نزول ہورہا ہے اس سے اہل کتاب کی اکثریت کے کفر اور سرکشی میں اضافہ ہوتا رہے گا)۔

مولانا رومی جو امت میں حکماء کی فہرست میں سب سے بڑے داناؤ شمار ہوتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ہر شخص کا نفس فرعون بننے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے مگر قوت اور وسائل نہ ہونے کی وجہ سے وہ فرعونیت کی راہ پر گامزن ہونے سے قاصر ہوتا ہے۔

مولانا کا یہ بھی کہنا ہے کہ نفس کی ہر سانس سے مکر وفریب کی بہت سی واردات وابستہ ہیں۔ اور نفس کے اس مکر وفریب سے فرعونیت اور شیطنت وجود میں آتی ہے۔

نفس کی قوت کے بارے میں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس میں سارے درندوں سے زیادہ درندانہ قوت موجود ہے۔نفس کی طاقت ایٹم بم کی طاقت سے بھی بڑھکر ہے۔ آخر فرعون صفت انسانوں نے یہی ایٹم بم جاپان کے دوشہروں پر گرا کر لاکھوں انسانوں کو ہلاک کردیا تھا۔ اور اب دنیا کے چند ہزار عالمی سرمائیدار دولت کی حرص کی خاطر کروڑوں انسانوں کو بھوکوں مارنے کے لئے کوشاں ہیں۔

اسلام اور تہذیب یورپ

ایک مغربی دانشور کا عالم اسلام کی ممتاز علمی شخصیت سے مکالمہ

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی شام میں اخوان المسلمون کے بے مثل قائد تھے، کئی برس تک دمشق یونیورسٹی کی شریعہ کے فیکلٹی کے سربراہ اور علمی مجلّہ ''حضارۃ الاسلام'' کے مدیر بھی رہے، انتقال سے ایک سال قبل سنہ۱۹۶۳ء میں موصوف علاج کی غرض سے مغربی جرمنی گئے، تو واپسی پر ایک جرمن صحافی نے آپ سے یہ انٹرویو لیا، جو''حضارۃ الاسلام'' (دسمبر ۱۹۶۴ء) میں شائع ہوا تھا۔ پانچ عشروں سے زیادہ عرصہ گذرنے کے باوجود اہل مغرب کے لہجہ میں آج بھی وہی طنطنہ ہے، دراصل تہذیبوں کا تصادم کوئی جدید نظریہ نہیں، اسلامی تحریکات کے قائدین پہلے بھی آج کی طرح اس کا سامنا کر رہے تھے۔ **(ادارہ)**

جرمن صحافی: استعمار اور معاشرتی پس ماندگی کے خلاف مسلمانوں میں جو تحریکات چل رہی ہیں، ان کے بارے میں اسلام کا موقف کیا ہے؟

ڈاکٹر سباعی: اسلام دین آزادی ہے، وہ نہ یہ پسند کرتا ہے کہ مسلمان کسی بھی سامراجی طاقت کے آگے جھکیں اور نہ یہ کہ وہ کاروبار زندگی میں پیچھے رہ جائیں، اسلام ہی کی تعلیمات نے عربوں کو۱۴ سو برس سے ہر قسم کے بے ہودہ رسم ورواج سے محفوظ رکھا ہے، یہ اسلام ہی تھا، جس نے عربوں کو امن وانصاف اور آزادی کا پیغامبر بنا کر اقوام عالم کی طرف بھیجا، انہیں تہذیب سکھائی، ان کی آنکھوں سے جہالت کے پردے ہٹائے، انہیں تمام بندگیوں سے آزاد کرکے، ایک خدا کا بندہ بنایا اور ان کے اندر انسانی بھائی چارے کی وہ روح پھونکی، جو کوئی دوسرا قدیم وجدید دین یا فلسفہ پھونکنے پر قادر نہ تھا۔

جرمن صحافی: پھر کیا وجہ ہے کہ موجودہ زمانے میں مسلمان متمدن اقوام سے پیچھے رہ گئے ہیں؟

ڈاکٹر سباعی: اس کے بہت سے اسباب ہیں اور ان میں سب سے زیادہ اہم سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ سامراج سے متاثر ہے، جب سے مسلمان ممالک اس سامراجی نظام میں گرفتار ہوئے ہیں، سامراج اپنے تمام وسائل وذرائع کے ساتھ پیہم اسلام کی بیخ کنی کرنے، اس کی تعلیمات کا حلیہ بگاڑنے اور نئی نسلوں کو اس کی روح سے بیگانہ کرنے میں مصروف رہا ہے، چنانچہ مسلمانوں کی اسلام کی طرف بازگشت میں دراصل اقوام مغرب ہی سنگ گراں بنی ہوئی ہیں۔

جرمن صحافی: میں یہ باور نہیں کرسکتا کہ امریکا، برطانیہ اور فرانس اسلام سے متحارب ہیں؟

ڈاکٹر سباعی: اسلام کے ساتھ اس عداوت میں شرق وغرب کی شرکت میں ہمیں کوئی شبہ نہیں ہے، میں ابھی چند روز قبل مغربی جرمنی سے واپس آیا ہوں، جو کچھ میں نے وہاں دیکھا، اسے میں آپ کے سامنے مغرب کی اسلام دشمنی کے ثبوت میں بطور مثال کے عرض کرتا ہوں، مجھے اس چیز نے پریشان کر دیا کہ وہاں ہر میدان میں خواہ وہ فکر ونظر کا میدان ہو یا پروپیگنڈے کا، یونیورسٹی ہو یا گرجا یا نجی مجالس، ریڈیو ہو یا ٹیلی ویژن، غرض ہر جگہ اسلام کے حقائق کو مسخ کرنے اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے ایک منظّم منصوبہ موجود ہے، کیا آپ اس سے انکار کر سکتے ہیں؟

جرمن صحافی: یہ درست ہے، ہوسکتا ہے اس کا سبب یہ ہو کہ آپ تہذیب کا ساتھ دینے کے بجائے پیچھے رہ گئے۔

ڈاکٹر سباعی: ہم کس میدان میں آپ کو اپنی تہذیب سے پسماندہ نظر آتے ہیں؟

جرمن صحافی: عورت ہی کے مرتبے کو لے لیجئے، آپ یہ گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ عورت اپنے شوہر کے ساتھ مجالس ومحافل اور رقص وسرود میں شرکت کرے، آپ مصر ہیں کہ وہ کارخانے میں کام نہ کرے؟

ڈاکٹر سباعی: کیا آپ کے ہاں عورت کا مقام گھر سے نکلنے کے بعد معاشرتی نقطہ نظر سے محفوظ ومامون ہوگیا ہے؟ کیا اس چیز نے آپ کو گھریلو نظام کی تباہی تک نہیں پہنچایا اور کیا سال بہ سال آپ کے ہاں اخلاقی جرائم اور ناجائز اولاد میں اضافہ نہیں ہورہا ہے؟

جرمن صحافی: میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ ہمارا گھریلو نظام بری طرح تباہ ہوچکا ہے اور اس تباہی کے ہاتھوں ہم نے بڑے دکھ اٹھائے ہیں، لیکن یہ ایک ایسا تاوان ہے، جس سے ہم علمی ترقی کے ذریعہ عہدہ برآ ہوگئے ہیں۔

ڈاکٹر سباعی: جب آپ پر عورت کے عام محفلوں میں جانے کے نقائص اور مضرات واضح ہوچکے ہیں، تو پھر آپ ہم پر اپنا فلسفہ کیوں ٹھونسنا چاہتے ہیں، حالانکہ آپ خود اس کی بہت بڑی قیمت ادا کر چکے ہیں اور ہم سے ہمارا فلسفہ کیوں چھڑانا چاہتے ہیں، جس نے ہمارے گھریلو نظام کی مسلسل ایک ٹھوس ستوں کی طرح حفاظت کی ہے۔

جرمن صحافی: میں چاہتا ہوں کہ اس نکتہ کی وضاحت کردوں، آپ ہماری علمی ترقی کے حاجت مند ہیں اور ہم آپ کو یہ ترقی دے بھی سکتے ہیں، لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر آپ یہ چاہیں کہ ہماری تہذیب کا کوئی ایک پہلو لے لیں، تو ایسا نہیں ہوسکتا، بلکہ آپ کو یہ کل کی کل، اپنے تمام محاسن ومعائب کے ساتھ لینی پڑے گی اور آپ کو اس کی وہی قیمت ادا کرنی پڑے گی، جو ہم کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر سباعی: میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کے ہاں عورت کا گھر سے باہر نکلنا اور اس کا کارخانوں میں کام کرنا، ایک تہذیبی اساس کی حیثیت رکھتا تھا اور کیا آپ کی تہذیب اس کے بغیر نہیں چل سکتی تھی؟

جرمن صحافی: جب ہماری صنعتی ترقی کی ابتدا ہوئی، اس وقت ہمارے ہاں مردوں کی تعداد اتنی نہیں تھی کہ وہ صنعتی پیداوار کے لئے کافی ہوسکتی، اس لیے ہم اس بات پر مجبور ہوگئے کہ عورتیں بھی کارخانوں میں جاکر کام کریں۔

ڈاکٹر سباعی: تو پھر آپ ہم سے اس چیز کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں، جسے آپ نے تو مجبورا اختیار کیا، لیکن ہم اسے اختیا کرنے پر مجبور نہیں ہیں اور میری رائے میں تو دراصل آپ کو دو امور نے عورت کو اس کے گھر سے نکال کر عمومی زندگی میں لانے پر مجبور کیا ہے: اولا یہ کہ آپ لوگ ہر وقت اور ہر جگہ عورت کو اپنے پہلو میں دیکھنا پسند کرتے ہیں، ثانیا آپ لوگ اس کے اخراجات بحیثیت بیوی یا بیٹی اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں، اس لیے آپ نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ کارخانوں میں جائے اور اپنے اخراجات خود اٹھائے، ان

دونوں وجوہات کا ہمارے ہاں کوئی وجود نہیں ہے، اسلام اس قسم کے اختلاط کی اجازت نہیں دیتا، چنانچہ ہمارے ہاں مرد، عورت کو ہر جگہ دیکھنے کا خواہش مند نہیں ہے اور اسلام کا نظام نفقات ایک مرد کے لیے یہ لازم کرتا ہے کہ وہ اپنی ماں، بیوی اور بیٹی کے اخراجات برداشت کرے، یہاں تک کہ وہ شادی کرلے، یہی چیز عورت کو ان فرائض کی ادائیگی کے لئے فارغ کردیتی ہے، جو اس پر گھر اور بچوں کی طرف سے عائد ہوتے ہیں، اس طرح ہم اپنے گھریلو نظام کے استحکام اور اپنے معیار اخلاق کی بلندی کو باقی رکھتے ہوئے بھی آپ کی علمی ترقی حاصل کر سکتے ہیں، آپ کے مشہور رسالے ''سیٹرن'' نے اپنی گذشتہ ستمبر کی اشاعت میں جرمنی میں مزدور عورتوں کے بارے میں ایک تحقیقی فیچر شائع کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان عورتوں کی اکثریت اس لئے کام کرتی ہے کہ کوئی ان کے اخراجات برداشت کرنے والا نہیں ہے، نیز یہ کہ اس طرح اپنے ہم کاروں ہی میں سے انہیں شوہر کے حصول کی بھی امید ہوتی ہے، ہمارے ہاں عورت یہ دو وجوہات نہیں پاتی کہ ان کی بنا پر وہ کام کرنے پر مجبور ہو۔

جرمن صحافی: مجھے شبہ ہے کہ آپ ہماری تہذیب کی مضرتوں سے بچ نہیں سکیں گے!

ڈاکٹر سباعی: مجھے یقین ہے کہ ایسا ممکن ہے، بشرطیکہ ہمارے ہاں ایسی حکومتیں ہوں، جو ہماری ترقی کو صحیح سمت میں عزت نفس کے جذبے سے سرشار ہو کر اور کورانہ تقلید سے پاک رہ کر ڈال سکیں۔

جرمن صحافی: ہم ایک اور موضوع لیتے ہیں، یورپ میں کیتھولک کلیسا اپنی لچک اور ارتقاء کے ذریعے سے لوگوں کے دلوں میں اپنے مقام کی حفاظت کرنے میں کامیاب ہوگیا، کیا اسلام میں بھی اتنی لچک ہے کہ وہ زندگی کے ارتقاء کا ساتھ دے سکے؟

ڈاکٹر سباعی: اس کے لئے ہمیں مفاہیم کو متعین کرلینا چاہیے، آخر لچک اور ارتقاء سے آپ کی کیا مراد ہے؟ آیا لچک اور ارتقاء وہی ہے، جس کا نظارہ ہم نے یورپ میں کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے ہاں کلیسا کی لچک نوجوان مردوں اور عورتوں کے کلب کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، جس میں رقص وشراب کی محفلیں پادری کی نگرانی میں جمتی ہیں، بلکہ وہی ان کا افتتاح رقص وشراب کے ساتھ کرتا ہے، اس کلب میں لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط پکنک پارٹیاں ہوتی ہیں، جن میں ان اخلاقی جرائم کا عدم وقوع محال ہوتا ہے، جن کی نفی میں تمام ادیان ومذاہب متفق ہیں، سو، اگر آپ اسلام سے بھی یہ چاہتے ہیں کہ اس میں بھی ایسی ہی لچک پیدا ہوجائے تو یہ تو ہونے سے رہا، دراصل اسلام کے کچھ آداب اور اس کا ایک خاص نظام ہے، جس سے اگر بغاوت کی جائے تو وہ کوئی دین جدید تو ہوسکتا ہے، اسلام نہیں ہوسکتا اور پھر آخر اس دین کا فائدہ ہی کیا، جو طبیعت کی طغیانی پر بند نہ باندھے اور گناہ ونافرمانی پر حد نہ لگائے۔

جرمن صحافی: پھر تو آپ کو مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا، کیتھولک کلیسا نے عوام کے دلوں میں اپنے اثر کی حفاظت کی طرف سے غفلت برتی ہے اور اسی چیز کا خطرہ مجھے اسلام کے بارے میں ہے کہ اس میں بھی لچک نہیں ہے۔

ڈاکٹر سباعی: میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کی نظر میں زنا اور شراب نوشی مضر ہیں یا نہیں؟

جرمن صحافی: مضر ہی نہیں، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ یہ دونوں چیزیں حرام ہیں۔

ڈاکٹر سباعی: لیکن کلیسا تو اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، خود جرمنی میں صوم کبیر سے پہلے کارنیوال کے مہینوں میں جو جشن مسلسل تین دن تک کلیسا کے علم اور اس کی نگرانی میں منایا جاتا ہے، اس میں لوگوں کو ہر قسم کی اخلاقی اور دینی چھوٹ دے دی جاتی ہے، اعداد وشمار سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر سال کارنیوال کے بعد کنواری حاملاؤں کی تعداد پچھلے سال کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہوتی ہے، اس کے بعد وہ اور کون سا اثر ہے، جو لوگوں کے دلوں میں کلیسا کا باقی رہ جاتا ہے؟ یہ کس قسم کی لچک ہے کہ آپ چاہتے ہیں کہ اسلام میں بھی پیدا ہوجائے؟ شاید آپ کو یہ بات معلوم ہوگی کہ آپ کے ہاں لوگوں کو کلیسا کے ساتھ اتنا تعلق نہیں ہے، جتنا کہ آپ چاہتے ہیں کہ ہو، بلکہ حکومت کی پشت پناہی اور لوگوں پر کلیسائی ٹیکس لگانے کے باوجود کلیسا سے بے زاری دن بدن بڑھتی چلی جارہی ہے، یہاں تک کہ بعض جرمنوں نے تو بدھ مت، اختیار کرکے فرینکفرٹ میں باقاعدہ مندر تک بنا لیا ہے، آپ جانتے ہیں کہ بدھ مت بت پرستی ہے، انسانی عقل نے بعض اقوام میں اسے اس زمانے میں قبول کیا تھا، جب کہ جہالت اور تاریکی کا دور ودورہ تھا، کیا یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کہ اس بیسویں صدی میں یورپی عقل اس بت پرستی کو قبول کررہی ہے اور اس کے لیے مندر تعمیر کررہی ہے؟ لوگوں کے دلوں میں کلیسا کا وہ اثر ہے کہاں، جس کے متعلق آپ ارشاد فرماتے ہیں؟

اگر آپ اسلام سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ بھی لچکدار ہوجائے اور لوگوں کو ہوا وہوس

میں کھیل کھیلنے کی چھٹی دے دے، تو میں آپ پر واضح کردیتا ہوں کہ اس قسم کی لچک تو اسلام میں موجودنہیں ہے، البتہ جو لچک اسلام میں موجود ہے وہ یہ ہے کہ ہر اچھی چیز سے استفادہ کیا جائے، علم اور فکری ارتقاء کے وسائل اختیار کیے جائیں، اس لچک کا اظہار خود آپ کے ہاں اور یورپ وامریکا میں ہمارے وہ سینکڑوں اسلام پسند نوجوان کرتے ہیں، جو آپ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں اور آپ کی تہذیب کے عین قلب میں رہتے ہوئے بھی اپنے اخلاق وکردار کی حفاظت کرتے ہیں، جیسا کہ اسلام ان سے مطالبہ کرتا ہے، وہ نہ شراب پیتے ہیں، نہ بے راہ روی اختیار کرتے ہیں، نہ ان کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی آتی ہے، یہی وہ چیز ہے جس سے ان کے اساتذہ اور ان کے ہمسایوں کے نزدیک ان کا مقام بلند ہوجاتا ہے، میں خود سن چکا ہوں کہ جرمن اور دوسرے یورپین ان کے شریفانہ کردار پر کس قدر حیرت زدہ ہوتے ہیں، مجھ سے ایک جرمن نے جو ایسے ہی ایک نوجوان اور اس کی استقامت سے واقف تھا، کہا کہ یہ نوجوان تو راہب معلوم ہوتے ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ آج ساری دنیا میں ان کے سے اخلاق اور استقامت کا اور بھی کوئی ہوگا، اسلام میں اگر کوئی لچک ہے تو بس یہی اس کی مثال ہے، اسلام علم کا خیر مقدم کرتا ہے، تہذیب وتمدن سے استفادہ کرتا ہے، لیکن ان کے معائب اور نقائص سے دامن بچاتا ہے اور یہی دلیل ہے اس بات کی کہ ہم آپ کی تہذیب اور علمی ترقی سے استفادہ کر سکتے ہیں، بغیر اس کے کہ آپ کی تہذیب کے کانٹوں سے دامن دریدہ ہوں۔

جرمن صحافی: یہ صحیح ہے، مجھے جرمنی میں اسی طرح کے چند نوجوانوں کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے، حقیقت یہ ہے کہ تہذیب کی ترغیبات وتحریصات سے جس طرح ان لوگوں نے اعراض کیا ہے، میں خود اس پر دنگ رہ گیا، حتی کہ میں نے جب اپنی ایک نشری گفتگو میں کہا کہ جرمنی اور یورپ کے مختلف ممالک میں ۲۴، ۲۴ اور ۲۵، ۲۵ برس کے ایسے نوجوان رہتے ہیں، جو لذت وصال سے ناآشنا ہیں، تو کسی نے میری بات پر اعتبار نہ کیا، البتہ جہاں تک کارنیوال کا تعلق ہے تو شاید اس کا سبب کیتھولک مذہب کا اعتراف (Confession) ہے جو اسلام میں موجودنہیں ہے اور یہی چیز آپ کے نوجوانوں کو عیاشیوں میں غرق ہونے سے روکتی ہے۔

ڈاکٹر سباعی: اسی سے آپ دیکھئے کہ ہم آپ کے ہاں اس وجہ سے نہیں جاتے ہیں کہ آپ کی اجتماعی زندگی کے انداز اور اس کی اخلاقی قدریں ہمیں بھاگئی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم آپ کی لغزشوں میں حصہ دار بنے بغیر آپ کی علمی ترقی سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

جرمن صحافی: میں آپ کا از حد شکر گذار ہوں، آپ نے مجھے ایک ایسی حقیقت سے روشناس کیا ہے، جس سے ہم اب تک غافل تھے اور وہ یہ کہ ہم اپنی اجتماعی زندگی کے مظاہر سے آپ کو مرعوب نہیں کر سکتے، آپ اس کے معائب سے پوری طرح باخبر ہیں اور اس سے دور رہنے کی کوشش کررہے ہیں، اسی طرح میں اس بات کے لیے بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اسلام کے بارے میں میری غلط فہمیاں رفع کردیں، آج تک مجھے اپنے متعلق یہ خیال رہا کہ میں سب سے زیادہ اسلام اور مسلمانوں اور ان کے تہذیبی مسائل کو جانتا ہوں، لیکن آپ نے مجھے بتایا کہ میں بہت کچھ نہیں جانتا۔

اہل پاکستان قرضوں کی دلدل میں

اسباب پر ایک نظر

پاکستان کے صدر ممنون حسین نے اسلام آباد میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے صاف کہا کہ حکومت کشکول گدائی نہیں توڑ سکتی۔ انہوں نے کہا کہ کشکول توڑنے کے بجائے ہمیں مزید قرضے لینے ہوں گے، کیونکہ حکومت کو ۱۴۸۰۰ ارب روپے کے قرضے ورثے میں ملے ہیں۔ صدر نے کہا کہ قرضے ہمارے لیے افیون کا نشہ بن چکے ہیں، اس نشے سے جان چھڑانے کے لیے ہمیں مزید افیون کھانی ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ ہماری حکومت فرشتوں پر مشتمل نہیں، تاہم حکومت صحیح سمت میں گامزن ہے۔ عوام مزید تین سال انتظار کریں، ہم انہیں مہنگائی، بے روزگاری، غربت اور بجلی کی لوڈشیڈنگ سے نجات دلائیں گے۔

میاں نواز شریف، حزب اختلاف میں تھے تو وہ خود کو آصف علی زرداری کا بہترین نعم البدل قرار دیتے تھے، مگر مبصرین کی اکثریت اب یہ کہتی نظر آتی ہے کہ وہ آصف علی زرداری کا بدترین نعم البدل ثابت ہوئے ہیں، اس لیے کہ ان کی حکومت نے سات ماہ میں عوام کے ساتھ وہ سنگین مذاق کیا ہے، جو پیپلز پارٹی کی حکومت نے پانچ سال میں کیا تھا۔ میاں صاحب کی انتخابی مہم کو یاد کیا جائے تو وہ انقلابی تھی۔ میاں صاحب اقتدار میں آتے ہی غربت اور مہنگائی پر قابو پانے والے تھے اور بجلی کی لوڈشیڈنگ چھ سال ماہ میں ختم ہونے والی تھی۔ مگر اب میاں صاحب کا یہ حال ہے کہ وہ قومی زندگی کے تلخ حقائق پر خود کلام کے بجائے صدر ممنون جیسی شخصیت کا سہارا لے رہے ہیں۔ یہ حقیقت راز نہیں کہ صدر ممنون نے جو کچھ کہا ہے، میاں صاحب وہی کچھ کہتے تو ملک میں زبردست ہنگامہ ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میاں صاحب کی ساکھ اور صدر ممنون حسین کی ساکھ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میاں صاحب ملک کے وزیراعظم اور مسلم لیگ (ن) کے ''مالک'' ہیں، ۔ اور ممنوں حسین صدر مملکت ہونے کے باوجود میاں صاحب کی جماعت کے معمولی وفادار کارکن ہیں۔ اس کے باوجود صدر ممنون حسین کا بیان کئی اعتبار سے محل نظر ہے۔

پاکستان کی سیاست کا یہ عجیب پہلو ہے کہ یہاں جو اقتدار میں آتا ہے، یہ ضرور کہتا ہے کہ اسے مسائل ورثے میں ملے ہیں۔ جنرل پرویز مشرف اقتدار میں آئے تھے تو کہا کرتے تھے کہ انہیں تباہ حال معیشت ورثے میں ملی۔ پیپلز پارٹی کی گزشتہ حکومت اقتدار میں آئی تو اس نے بھی قوم کو یہی بتایا کہ اسے خرابیاں ورثے میں ملی ہیں۔ اب صدر ممنون حسین نے یہی راگ الاپا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب مسائل کا ورثے میں ملنا طے ہے تو پاکستان کے حکمران بالخصوص سیاسی حکمران حزب اختلاف میں ہوتے ہوئے قوم کو یہ کیوں نہیں بتاتے کہ ہم اقتدار میں آئے تو ہمیں مسائل ورثے میں ملیں گے اور ہم کوئی مسئلہ فورا حل نہیں کرسکیں گے۔ جہاں تک کشکولِ گدائی توڑنے کا تعلق ہے تو اس کا دعویٰ خود میاں نواز شریف نے کیا تھا۔ بلاشبہ قرضوں کی معیشت میاں نواز شریف نے تخلیق نہیں کی، لیکن انہوں نے کشکول گدائی توڑنے کا دعوی خود کیا تھا، تاہم جو کچھ ہورہا ہے، وہ یہ ہے کہ کشکولِ گدائی بڑے سے بڑا ہوتا جارہا ہے۔

یہاں تک کہ کشکولِ گدائی کے بڑا ہونے سے بھی ملک وقوم کو فائدہ نہیں ہورہا۔ حکومت نے آئی ایم ایف سے ساڑھے چھ ارب ڈالر کا قرض لیا تھا تو توقع تھی کہ اس سے چار اہداف کے حصول میں مدد ملے گی:

(۱) مارکیٹ کا اعتماد بحال ہوگا۔

(۲) دوسرے ذرائع سے مالی وسائل میسر آئیں گے۔

(۳) زرمبادلہ کے ذخائر کی صورت حال بہتر ہوگی۔

(۴) ملک دیوالیہ ہونے سے بچ جائے گا۔

تاہم ماہرین اقتصادیات کہہ رہے ہیں کہ ان چاروں اہداف میں سے صرف ایک ہدف حاصل ہوا ہے اور وہ یہ کہ ملک دیوالیہ ہونے سے بچ گیا ہے۔ تاہم اقتصادی ماہرین کے مطابق یہ خطرہ بھی عارضی طور پر ٹلا ہے۔ جہاں تک غیرملکی زرمبادلہ کے ذخائر کا تعلق ہے تو ماہرین کے بقول قرض لینے کے بعد سے اب تک ان ذخائر میں دو ارب ڈالر کی کمی ہوئی ہے۔ اعداد وشمار کے مطابق جولائی ۲۰۱۳ء سے نومبر ۲۰۱۳ء تک غیرملکی سرمایہ کاری میں

۱۳ فیصد کمی ہوئی ہے۔

اس طرح ادائیگیوں کے توازن کی صورت حال بھی خراب ہوئی ہے۔ اس کی وجہ ماہرین کے نزدیک یہ ہے کہ جولائی ۲۰۱۳ء سے نومبر ۲۰۱۳ء تک برآمدات میں صرف ایک فیصد اور درآمدات میں تین فیصد اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ جولائی سے نومبر تک ادائیگیوں کے توازن میں ملک کو ۱۱۸۵ ملین ڈالر کے خسارے کا سامنا تھا، جب کہ ۲۰۱۲ء میں اسی عرصے کے دوران ملک کو ادائیگیوں کے توازن کے دائرے میں ۶۸۴ ملین ڈالر خسارے کا سامنا تھا۔ ان حقائق سے یہ بات واضح ہورہی ہے کہ معیشت کی بہتری کے سلسلے میں نواز حکومت کا تجزیہ سرسری، سطحی، تکنیکی اور روایتی ہے اور قرضوں کی معیشت سے ملک کی جان چھڑانا اس کے بس کی بات نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پاکستان میں قرضوں کی معیشت وجود میں کیوں آئی؟

انسانی تاریخ میں قرض کا تصور ''بوجھ'' کا تصور ہے اور اس سلسلے میں ایک فرد، خاندان یا قوم کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ قرض ایک فرد اور ایک خاندان کے لیے جتنا ضرر رساں ہے، ایک قوم کے لیے اس سے کہیں زیادہ نقصان دہ ہے۔ لیکن ہمارے حکمرانوں نے قرض کو نظری سطح پر ایک ''بوجھ'' کے بجائے ایک ''سہولت'' میں ڈھال دیا ہے۔ اس صورتِ حال کے بغیر ہماری معیشت قرضوں کی معیشت نہیں بن سکتی تھی۔ لیکن قرض ایک بوجھ کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب واضح ہے۔ زندگی صرف امکانات کا نہیں، اندیشوں کا بھی نام ہے۔ چنانچہ اسے بوجھ کے بغیر بسر کرنا بوجھ کے ساتھ بسر کرنے سے ہزار گنا نہیں، لاکھ گنا بہتر ہے۔ تجزیہ کیا جائے تو زندگی کا اصول سیدھا سادا ہے۔ انسان کو چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہئیں۔ یعنی انسان یا قوم کی جتنی آمدنی ہو، اس کا خرچ بھی اتنا ہی ہونا چاہیے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ انسان کماتا تو سو روپے ہو اور خرچ وہ پانچ سو روپے کرتا ہو۔ لیکن پاکستان کے حکمران طبقے نے کبھی آمدنی اور خرچ کے اس اصول کو سمجھ کر نہیں دیا۔ چنانچہ ایک وقت تھا کہ قرض ہماری ''ضرورت'' تھا۔ ضرورت سے وہ ''عادت'' میں تبدیل ہوا۔ اور قرض کی عادت اب ایک ''نشے'' میں ڈھل چکی ہے۔ اور نشہ کرنے والوں کی تاریخ یہ ہے کہ وہ گھر بار ہی کو نہیں بہو، بیٹیوں تک کو بیچ کھاتے ہیں۔ چنانچہ صدر ممنون حسین نے کہہ تو دیا کہ قرض ہمارے لیے نشہ بن چکا ہے، مگر وہ نشے کے اخلاقی، نفسیاتی اور سماجی ومعاشی مضمرات سے آگاہ نہیں ہیں۔ آگاہ ہوتے تو وہ خود کو اس نشے کا عادی کہتے ہوئے سو بار سوچتے۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ ایک فرد کی معیشت اور ایک ملک کی معیشت میں بڑا فرق ہے۔ جدید ریاست ایک پیچیدہ حقیقت ہے اور اس حقیقت میں قرض کا تصور بھی موجود ہے۔ لیکن اس دائرے میں بھی قرض کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ہمارے وسائل کم ہیں، چنانچہ ہم مزید محنت اور سرمایہ پیدا کرنے کے لیے قرض لیں گے۔ لیکن پاکستان کے حکمران طبقے نے قرض سے کبھی معیشت کو وسعت نہیں دی۔ اس نے قرض سے کبھی کاروبار اور صنعت کے دائرے کو وسیع نہیں کیا۔ اس نے کبھی قرض کو انسانی وسائل کی نتیجہ خیز بہتری کے لیے صرف نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا قرض کم ہونے کے بجائے بڑھتا چلا گیا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے قومی بجٹ کا بڑا حصہ دفاع، قرضوں کی ادائیگی اور تنخواہوں کی مد میں صرف ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ اب ہم قرض کی قسط ادا کرنے کے لیے بھی قرض لے رہے ہیں۔ غور کیا جائے تو یہ قرض کے اس تصور کی بھی کامل نفی ہے، جس کے دائرے میں قرض جدید ریاست اور معیشت بالخصوص ترقی پزیر معیشت کی ''ضرورت'' قرار دیا جاتا ہے۔ غور کیا جائے تو قرضوں کی معیشت کے پس منظر میں ہمارے حکمران طبقے کا تصور ذات بھی پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔ بلاشبہ قرض بھیک نہیں ہے، لیکن جب قرض نشہ بن جاتا ہے تو قرض بھی قرض نہیں رہتا، بھیک بن جاتا ہے، اور پوری انسانی تاریخ گواہ ہے کہ اپنی عزت کرنے والا دوسروں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے حکمران طبقے میں خود تکریمی کی انتہائی کمی ہے، اس لیے کہ انہوں نے پورے ملک کو بھکاری بنا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اس سے بھی ہولناک بات یہ ہے کہ انہوں نے بھیک کو نظام بنا کر اس کے مدلل دفاع کی صورت پیدا کردی ہے۔

ایک وقت تھا کہ چین اور ملائیشیا جیسے ملکوں نے بھی مغرب سے قرض لیا، مگر انہوں نے ایک ڈالر سے ۱۰ ڈالر پیدا کرکے، ایک ڈالر بر وقت واپس لوٹایا اور ۹ ڈالرز کو اپنی معیشت میں لگایا۔ لیکن ہمارے یہاں قرض کی صحت دن بہ دن بہتر ہورہی ہے اور معیشت کی حالت دن بہ دن گر رہی ہے۔ یعنی حکمرانوں نے قرض کو معیشت کے امراض کے علاج کے طور پر اختیار کیا تھا، لیکن قرض اب بجائے خود ایک بہت ہی بڑا مرض بن گیا ہے۔ ایسا

مرض جس کے علاج کی کوئی صورت حکمرانوں کو نہیں سوجھ رہی۔

مغربی دنیا کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ اس نے اپنی عسکری طاقت ہی کو نہیں اپنے علم اور اپنی تہذیب تک کو اپنے سیاسی غلبے اور دوسری قوموں کو اپنا غلام بنانے کے لیے استعمال کیا ہے۔ چنانچہ مغرب کے مالیاتی ادارے پہلے دن سے ایک نوآبادیاتی ایجنڈے کے تحت کام کررہے ہیں۔ چنانچہ پاکستان کی معیشت اگر قرضوں کی معیشت بن گئی ہے تو اس کی پشت پر مغرب کے مفادات موجود ہیں۔ مغرب نے اپنے مالیاتی اداروں کے ذریعے کئی کام کیے ہیں۔ اس نے ایک کام یہ کیا ہے کہ دوسرے ترقی پذیر ملکوں کی طرح پاکستان کو قرض کی بیساکھیوں کا عادی بنادیا۔ مغرب نے دوسرا کام یہ کیا کہ قرضوں کے ذریعے پاکستان کے حکمران طبقے کو بدعنوان بنایا۔ پاکستان میں وسائل کی لوٹ مار کی تاریخ کا غیرملکی قرضوں سے بھی گہرا تعلق ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ مغرب نے چالیس سال تک قرض دیا اور یہ نہیں پوچھا کہ تم قرض کا کیا کرتے ہو؟ چنانچہ پاکستان میں آنے والے قرض کی رقم یا تو خردبرد ہوگئی یا اس کا غلط استعمال ہوا۔ دونوں ہی صورتوں میں قرضوں کی معیشت مستحکم ہوئی۔ قرض دینے والوں کا کردار قرض دینے تک محدود ہوتا ہے، لیکن مغرب کے مالیاتی اداروں نے قرض دیتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ آپ کو اپنے مقامی مسائل کے سلسلے میں آئی ایم ایف اور عالمی بینک کا حل بھی قبول کرنا پڑے گا۔ پاکستان کے مسائل کیا ہیں، یہ بات پاکستان کے لوگ بہتر جانتے ہیں، لیکن اہل مغرب نے اس سلسلے میں مقامی دانش کو کبھی بروئے کار ہی نہیں آنے دیا۔ یہاں تک کہ اب ہمارا بجٹ بھی مغرب کے اقتصادی ماہرین تیار کرتے ہیں۔ مغرب کے ماہرین ہی بتاتے ہیں کہ بجلی اور گیس کے نرخ کیا ہوں گے اور قرضوں کی اقساط کب کب ادا کی جائیں گی؟ اس آخری نکتے کی اہمیت یہ ہے کہ بہت سے اقتصادی ماہرین کے نزدیک آئی ایم ایف کے قرض کے باوجود ہماری معیشت اس لیے بہتر نہیں ہورہی کہ آئی ایم ایف نے قرضوں کی ادائیگی کا دورانیہ انتہائی کم رکھا ہے، چنانچہ ہمارے پاس مالی وسائل جمع ہی نہیں ہو پاتے۔ جمع ہوتے ہیں تو قرض کی نئی قسط کی ادائیگی کا وقت ہوجاتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ بات وہ ماہرین کہتے ہیں جو قرض لینے کے خلاف نہیں ہیں۔

ڈالر لے کر نئی نسل کے دین وایمان کی غارت گری کی روش

بچوں کی نفسیات اور نشوونما کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ بچے کے ذہن کی دیواریں ایک خالی کینوس کی طرح ہوتی ہیں، جس پر قصوں، کہانیوں، دیومالاؤں، عظیم انسانوں کے کرداروں اور اخلاقیات سے مزین سچی نصیحت آموز داستانوں کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے، ایک ماحول کا فسوں طاری ہوتا ہے، ایک خوابوں کی دنیا وجود رکھتی ہے۔ خوابوں کی اس دنیا میں اچھے اور اعلیٰ کرداروں والے ہیرو ہوتے ہیں اور برے کرداروں والے ولن بھی۔ ایک سرزمین ہوتی ہے، جس پر پھول کھلتے ہیں، موسم بدلتے ہیں، فصلیں اپنی بہار دکھاتی ہیں اور گویا اس میں جیتے جاگتے انسان بستے ہیں۔ بچپن میں جیسا ماحول اور جیسی خوابوں کی دنیا بچے کے ذہن کے کینوس پر منقش کر دی جاتی ہے، وہی دنیا پوری زندگی اس کے لیے ایک حوالہ بن جاتی ہے۔

جس طرح ہیرو، اس کے ذہن کے پردے پر نقش ہوتے ہیں، وہ ساری زندگی ان کے سحر سے باہر نہیں نکل پاتا۔ جس طرح کی اخلاقیات وہ سیکھتا ہے، وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ خود کسی بھی طرح کے کردار میں ڈھل جائے، اس کی اخلاقیات کا معیار وہی رہتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہوتا ہے، جب بچہ اپنے وطن، اپنے علاقے اور اپنے موسموں سے محبت سیکھتا ہے۔ اسے آخری عمر میں بھی اسی ماحول کی ہواؤں کی سرسراہٹ اور مٹی کی خوشبو یاد آتی ہے۔ اس خوابوں کی دنیا اور ذہن کی سکرین پر بننے والی متحرک فلم کی ایک زبان بھی ہوتی ہے، یہ وہی زبان ہوتی ہے، جسے وہ عام دنیا میں، بازار جاتے، گھر میں رہتے، محبت، سیاست یا جنگ پر گفتگو کرتے ہوئے استعمال کرتا ہے۔ متحرک تصویریں اگر ایک علاقے کی ہوں اور زبان وہ دوسرے خطے کی بولیں تو ایک ایسی بے ربط سی دنیا وہاں آباد ہوجاتی ہے، جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن اگر زبان، ماحول، کردار اور اخلاقیات

سب کی سب ایک ہوں اور وہ اس بچے کے اپنے اردگرد کی ماحول سے اجنبی ہوں تو اس کا پہلا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کی اپنے ماحول اور لوگوں سے بیگانگی پیدا ہوجاتی ہے۔

خوابوں کی دنیا کے ماحول سے محبت اور چاہت ایسا خطرناک زہر ہے، جو گذشتہ تین سال سے میری قوم کے بچوں کو آہستہ آہستہ پلایا جارہا ہے۔ انہیں 0 لیول اور A لیول میں ایسی کہانیاں، قصے اور داستانیں ایسی زبان میں پڑھائی جارہی ہی ہیں، جوان کے اردگرد کی زبان ہے، نہ میڈیا کی اور نہ کسی شعبۂ زندگی ہی کی۔ یہ سب اس لیے یاد آرہا ہے کہ ڈیڑھ ارب ڈالر کی سعودی امداد پر ماتم کرنے والے، گورڈن براؤن کی ایک ارب ڈالر کی تعلیمی امداد پر خوشی کے شادیانے بجارہے ہیں۔

یہ امداد کیوں دی جارہی ہے؟ ایسی کیا خیر خواہی ہے کہ دنیا کا ہر ترقی یافتہ ملک پاکستان کو تعلیمی شعبے میں مدد دینے کے لیے تیار ہے؟ یو ایس ایڈ (US- AID) سے لے کر ڈی ایف آئی ڈی (DFID) تک سب اداروں کے ماہرین ہمیں علم سکھانے آرہے ہیں۔ ان کے تعلیمی ماہرین ہمارے نصاب کی نوک پلک سنوار رہے ہیں اور 0 اور A لیول کے امتحانات کو منعقد کروا کے ایک راستہ کھول چکے ہیں کہ ان امتحانات کے بعد آئندہ تعلیم کے لیے جب کوئی ان کی امداد یا اپنی دولت سے آکسفورڈ، کیمبرج یا ہارورڈ جائے تو اس کے دماغ کی دیواروں پر وہی ماحول ایک متحرک فلم کی طرح چل رہا ہو اور جیسے ہی لندن، بوسٹن، ہائیڈل برگ یا برکلے پہنچے تو اسے یوں لگے, جیسے وہ ان خوابوں کی سرزمین پر آ گیا ہے، جو اس نے بچپن میں دیکھے تھے۔

یہاں میں صرف O لیول اور A لیول کے کورس کی چند کتابوں کا ذکر کروں گا، ان کتابوں کا نہیں، جوان سکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں میں ہزاروں کی تعداد میں پہنچا دی گئی ہیں اور جس میں تحریک، قصے، کہانیوں، کردار یا اخلاقیات کا ہماری سرزمین اور علاقے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نصاب کی چند کتابیں اور ان کی جزئیات دیکھیں اور حیرت میں گم ہوجائیں کہ آپ کون سا زہر اپنی اولاد کی رگوں میں اتار رہے ہیں۔

A Christmas Carol پوری کتاب کرسمس کے تہوار اور عقائد کے گرد گھومتی ہے۔ وہی ماحول اور ویسی ہی رنگارنگی دکھائی گئی ہے، جیسی مغرب میں ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ بچے اپنے آپ کو اس مذہب اور تہذیب سے علیحدہ محسوس نہ کریں بلکہ اسے خواب کی صورت اپنے ذہن پر نقش کر لیں۔

The Golden Touch یہ لیول II میں پڑھائی جانے والی یونانی دیومالاؤں کے خداؤں کی داستانیں ہیں۔ جس بچے کو اللہ کی وحدانیت اور رسول ﷺ کی سیرت پڑھنی چاہیے، اسے وینس اور کیوپڈ کے معاشقے پڑھائے جاتے ہیں۔

King soleman,s Mines یہ کہانی جنسی تعلقات اور جنسی ناہمواری کے انیسویں صدی کے تصورات پر لکھی گئی ہے۔ یہ مرد اور عورت کے چھپے ہوئے جسمانی خزانوں کی تلاش کی کہانی ہے۔ اس میں مرد اور عورت کی جسمانی ہیئت کو انتہائی بے ہودہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب IV لیول میں پڑھائی جاتی ہے۔

The Emperor,s New Clothes and other Stories: اس کتاب میں موجودہ کہانی The Kiss اگر والدین پڑھ لیں تو حیرت اور شرم سے پانی پانی ہوجائیں۔

Treasure Island یہ لیول I میں پڑھائی جانے والی کتاب ہے۔ بحری قزاقوں کا ماحول دکھایا گیا ہے جس میں قزاق اپنے قانون رکھتے ہیں اور شراب کے نشے میں دھت رہتے ہیں۔

The Adventures of Sherlock Holmes: عشق ومحبت اور رسیلے جنسی جذبات سے نچڑی جاسوسی کہانیاں۔ جو لوگ نسیم حجازی کے ناولوں میں محبت پر اعتراض کرتے ہیں، اس جاسوس کی جنسی زندگی کس مزے سے پڑھا رہے ہوتے ہیں۔

Around the world in eighty days.

یہ لیول III کی کتاب ہے۔ اس کا ہیرو ایک شرط لگا کر دنیا کی سیر کو نکلتا ہے، جگہ جگہ شراب کے نشے میں دھت رہتا ہے اور ہر جگہ نئی محبت میں گرفتار۔

بعض عالمی ملحد فلاسفروں کے نظریات پر تبصرہ

ویسے تو الحادی نظریات بہت قدیم ہیں لیکن گذشتہ چار سؤ سال کے دوران ان کو یورپ میں کچھ پزیرائی حاصل ہوئی۔ پھر بیسویں صدی کے اوائل میں روس کی ملحد ریاست USSR وجود میں آئی، تو الحادی نظریات میں بہت زیادہ پھیلاء ہوا۔ اور پوری دنیا میں یہ مشہور ومعروف ہوگئے۔ ملحد فلاسفہ وسائنسدانوں میں جولین ہکسلے (Julian Huxley) آگسٹ کامٹے (August Comte)، برٹرانڈرسل (Bertrand Russel)، ڈارون (Darwin) اور کارل مارکس (Karl Marx) وغیرہ بہت مشہور ہوئے، اسی طرح ان کی آراء بھی مشہور ہوگئیں۔ یہاں ہم انہیں پر اپنا تبصرہ پیش کررہے ہیں۔

مذہب مخالف دلائل کے بارے میں کہا جاتا ہے ''یہ وہ ثبوت ہیں جس کی بنا پر اب دنیا میں مذہب کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔'' مگر یہ محض بے بنیاد دعویٰ ہے۔

(ا) علم طبیعات وفلکیات (Physics & Astronomy)

ماہرینِ طبیعات یہ کہتے ہیں کہ ''طبیعاتی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ یہاں جو واقعات ہورہے ہیں وہ ایک متعین قانون فطرت (LAW OF NATURE) کے مطابق ہورہے ہیں، اس لئے ان کی توجیہہ کے لئے کسی نامعلوم خدا کا وجود فرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ معلوم قوانین خود اس کی توجیہہ کے لئے موجود ہیں۔'' (جولین ہکسلے)

جواب: فطرت کا قانون (LAW OF NATURE)، کائنات کا ایک واقعہ ہے، وہ کائنات کی توجیہہ نہیں ہے۔

Nature is a fact, not an explanation.

مذہب بتاتا ہے کہ وہ اصل اسباب ومحرکات کیا ہیں جو کائنات کے پیچھے کام کررہے ہیں، جبکہ سائنس کی دریافتیں بتاتی ہیں کہ موجودہ کائنات کا ظاہری ڈھانچہ کیا ہے۔ سائنس کا سارا علم بتاتا ہے کہ ''جو کچھ ہے وہ کیا ہے'' یہ بات اس کی دسترس سے باہر ہے کہ وہ بتائے کہ ''جو کچھ ہے وہ کیوں ہے۔''

اس کی مثال مرغی کے بچہ کی ہے جو انڈے کے مضبوط خول میں پرورش پاتا ہے اور اس کے ٹوٹنے سے باہر آجاتا ہے۔ یہ کیسے ہوتا ہے کہ خول ٹوٹے اور بچہ جو گوشت کا لوتھڑا ہوتا ہے وہ باہر نکل آئے۔ پہلے انسان کہتا تھا کہ ''خدا ایسا کرتا ہے،'' مگر اب خوردبینی مشاہدہ سے معلوم ہوا ہے کہ جب ۲۱ روز کی مدت پوری ہوتی ہے تو اس وقت ننھے بچے کی چونچ پر ایک چھوٹا سا سخت سینگ نمودار ہوتا ہے۔ اس کی مدد سے وہ اپنے خول کو توڑ کر باہر نکل آتا ہے۔ سینگ اپنا کام پورا کرنے کے چند دن بعد خود بخود جھڑ جاتا ہے۔

مخالفین مذہب کہتے ہیں ''نئے مشاہدہ سے پرانا خیال غلط ثابت ہوگیا ہے کہ بچہ کو باہر نکالنے والا خدا ہے۔ خوردبین صاف دکھا رہی ہے یہ ایک قانون ہے جس کے تحت بچہ خول سے باہر آتا ہے۔'' مگر یہ ایک مغالطہ ہے۔ سائنسی مشاہدہ نے واقعہ کی چند مزید کڑیاں بتائی ہیں، اصل سبب نہیں بتایا۔ پہلے سوال خول کے ٹوٹنے کا تھا، اب سوال سینگ پر آیا ہے۔ بچے کا سینگ کے ذریعہ خول کو توڑنا واقعہ کی صرف درمیانی کڑی ہے، نہ کہ واقعہ کا سبب۔ واقعہ کا اصل سبب تب معلوم ہوگا جب ہم جان لیں کہ بچہ کی چونچ پر سینگ کیسے ظاہر ہوا، یعنی اس آخری سبب کا پتہ لگائیں جو بچہ کی اس ضرورت سے واقف تھا کہ اس کو خول سے باہر نکلنے کے لئے کسی سخت مددگار کی ضرورت ہے اور اس نے مادہ کو مجبور کیا کہ عین ٹھیک وقت پر یعنی ۲۱ روز بعد وہ بچہ کی چونچ پر ایک سینگ کی شکل میں نمودار ہو، جو اپنا کام پورا کرنے کے بعد جھڑ جائے۔ ظاہر ہے کہ دونوں حالتوں میں کوئی نوعی فرق نہیں، اسے زیادہ سے زیادہ حقیقت کا وسیع تر مشاہدہ کہہ سکتے ہیں، حقیقت کی توجیہہ کا نام نہیں دے سکتے۔

ایک ماہر حیاتیات سیسل (Cecil Boyce Hamann) کے الفاظ کا خلاصہ اس طرح ہے۔

''غذا ہضم ہونے کو پہلے خدا کی قدرت کہا جاتا تھا۔ اب اسے کیمیائی ردعمل کا نتیجہ کہا جاتا ہے۔ مگر کیا اس کی وجہ سے خدا کے وجود کی نفی ہوگئی؟ آخر وہ کون ہے جو کیمیائی اجزاء کو پابند کرتا ہے کہ وہ اس قسم کا مفید ردعمل ظاہر کریں۔ غذا انسان کے جسم میں داخل

ہونے کے بعد ایک عجیب خودکار نظام کے تحت جس طرح مختلف مراحل سے گذرتی ہے۔ اس کو دیکھنے بعد یہ کہنا بالکل لغو بات ہے کہ یہ حیرت انگیز انتظام محض اتفاق سے وجود میں آ گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مشاہدہ کے بعد تو اور بھی زیادہ ضروری ہوگیا ہے کہ ہم یہ مانیں کہ خدا اپنے ان عظیم قوانین کے ذریعے عمل کرتا ہے، جس کے تحت اس نے زندگی کو وجود دیا ہے۔''

(The evidence of God in an expanding universe, P.221)

سائنس نے انسان کے مشاہدہ کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اس نے دکھا دیا ہے کہ وہ کون سے فطری قوانین ہیں جو اس کائنات میں کارفرما ہیں۔ مثلاً پہلے آدمی صرف یہ جانتا تھا کہ پانی برستا ہے مگر اب سمندر کی بھاپ اٹھنے سے لے کر بارش کے قطرے زمین پر گرنے تک کا وہ پورا عمل انسان کو معلوم ہوگیا ہے، جس کے مطابق بارش کا واقعہ ہوتا ہے۔ مگر یہ ساری دریافتیں صرف واقعہ کی تصویر ہیں، وہ واقعہ کی توجیہہ نہیں ہیں۔ سائنس یہ نہیں بتاتی کہ فطرت کے قوانین، قوانین کیسے بن گئے، وہ کیسے اس قدر مفید شکل میں مسلسل طور پر زمین وآسمان میں قائم ہیں، اور اس صحت کے ساتھ قائم ہیں کہ ان کی بنیاد پر سائنس میں قوانین مرتب کئے جاتے ہیں۔ قوانین کو دریافت کر لینے کو توجیہہ کہنا محض دھوکا ہے، اور درمیانی کڑی کو آخری کڑی قرار دینا ہے۔

Nature does not explain she is herself in need of explanation.

یعنی فطرت، کائنات کی توجیہہ نہیں کرتی، وہ خود اپنے لئے توجیہہ کی طالب ہے۔

سوال: آپ کسی ڈاکٹر سے پوچھیں کہ خون کیوں سرخ ہوتا ہے؟

جواب: خون کے اندر چھوٹے چھوٹے ذرات کی وجہ سے۔

سوال: یہ ذرات سرخ کیوں ہوتے ہیں؟

جواب: ہیموگلوبین (Haemoglobin) کی وجہ سے جو پھیپھڑوں سے آکسیجن لے کر سرخ ہوجاتا ہے۔

سوال: مگر ہیموگلوبن کے حامل سرخ ذرات کہاں سے آتے ہیں؟

جواب: وہ تلی میں بن کر تیار ہوتے ہیں۔

سوال: ایسا کیوں ہے کہ سرخ ذرات تلی کے اندر اس قدر صحت کے ساتھ عمل کررہے ہیں؟

جواب: یہ قانون قدرت ہے۔

سوال: قانون قدرت کیا ہے؟

جواب: اس سے مراد ہے۔

Blind interplay of Physical and Chemical Forces.

طبیعی اور کیمیائی طاقتوں کا اندھا عمل۔

سوال: مگر کیا وجہ ہے کہ یہ اندھی طاقتیں ہمیشہ ایسی سمت میں عمل کرتی ہے، جو انہیں متعین انجام کی طرف لے جائے، کیسے وہ اپنی سرگرمیوں کو اس طرح منظّم کرتی ہیں کہ چڑیا اڑنے کے قابل ہوسکے، مچھلی تیر سکے اور ایک انسان اپنی مخصوص صلاحیتوں کے ساتھ وجود میں آئے۔''

جواب: میرے دوست یہ نہ پوچھو، سائنسدان صرف یہ بتا سکتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ کسی طرح ہورہا ہے۔ اس کے پاس اس کا جواب نہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیوں ہورہا ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی مشین کے اوپر ڈھکن لگا ہو تو ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ چل رہی ہے۔ اگر ڈھکن اتار دیا جائے تو پتہ چلے گا کہ باہر کا چکر کس طرح ایک اور چکر سے چل رہا ہے اور وہ چکر کس طرح بہت سے پرزوں سے مل کر حرکت کرتا ہے۔ مگر کیا اس علم کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے مشین کے خالق اور اس کے سبب حرکت کا راز بھی معلوم کر لیا ہے؟ کیا کسی مشین کی کارکردگی کو جان لینے سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ وہ خودبخود بن گئی ہے اور اپنے آپ چلی جا رہی ہے، اگر ایسا نہیں تو کائنات کی کارکردگی کی بعض جھلکیاں دیکھنے سے یہ کیسے ثابت ہوگیا کہ یہ سارا کارخانہ اپنے آپ قائم ہے اور اپنے آپ چلا جا رہا ہے۔ (Haris) ہیرس نے کیا خوب کہا تھا:

Natural Selection may explain the svrvival of the Fittest, but cannot explain the arrival of the Fittest

(Revolt against Reason. A. Lunn, P. 133).

علم نفسیات Psychology

نفسیاتی دلیل پیش کی جاتی ہے کہ خدا اور آخرت یعنی دوسری دنیا کا تصور کوئی حقیقی چیز نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسانی شخصیت اور انسانی آرزوؤں کا کائناتی سطح پر قیاس ہے۔ (Freud)

جواب: یہ تو دلیل ہی نہیں۔ اس میں دلیل کی کونسی بات ہے؟

ہمیں معلوم ہے کہ جنین خلیہ (Zygote)، چھ فوٹ لمبے انسان کی سطح پر ایک شخص کی پیشینگوئی ہے یا ایٹم جو نظر بھی نہیں آتا، اس کے اندر ایسا نظام پایا جاتا ہے جو نظام شمسی کی سطح پر جو اربوں میل کے دائرے میں گردش کررہا ہے۔ پھر وہ شعور جس کو ہم انسان کی صورت میں تجربہ کر رہے ہیں، وہ اگر کائناتی سطح پر زیادہ مکمل حالت میں موجود ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

علمائے نفسیات کا یہ کہنا صحیح ہے کہ بچپن میں کبھی ایسی باتیں ذہن میں پڑ جاتی ہیں جو بعد میں غیر معمولی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں، مگر اس سے یہ استدلال کرنا کہ انسان کی یہی وہ خصوصیت ہے جس نے مذہب کو پیدا کیا، بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ ایک معمولی واقعہ سے غیر معمولی نتیجہ اخذ کرنا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی کو مٹی کی مورت بناتے دیکھوں تو پکار اٹھوں کہ بس یہی وہ شخص ہے جو انسانوں کا بھی خالق ہے۔ وہ آدمی بیشک مٹی کی گڑیا کا صانع ہے۔ مگر یہ کہنا کہ اس طرح کا کوئی اور آدمی تھا جس نے خود اس بنانے والے کو بنایا، ایک لغو بات ہے۔ اگر ایک شخص لاشعور میں دبے ہوئے خیالات کے تحت کبھی ''غیر معمولی'' باتیں بڑ بڑانے لگتا ہے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوگیا کہ انبیاء کی زبان سے جس کائناتی علم کا انکشاف ہوا ہے، وہ بھی اس قسم کی بڑ بڑاہٹ ہے۔ پہلے واقعہ کو مان کر دوسرے واقعے کے بارے میں استدلال کرنا ایک غیر علمی اور غیر منطقی بات ہے۔ اس سے فقط یہ ثابت ہوتا ہے کہ توجیہہ کرنے والے کے پاس نبی کے غیر معمولی کلام کو سمجھنے کے لئے کوئی اور معیار موجود نہیں تھا۔ اس کو ایک ہی بات معلوم تھی کہ بعض مرتبہ کوئی شخص خواب یا جنون یا بے ہوشی کی حالت میں کچھ ایسی باتیں کرتا ہے جو عام طور پر ہوش کی حالت میں نہیں کی جاتیں، اس نے فورا کہہ دیا کہ بس یہی وہ چیز ہے جو مذہبی باتوں کی ذمہ دار ہے، حالانکہ اس کے پاس حقیقت کو ناپنے کا ایک ہی معیار ہو تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بطور واقعہ بھی حقیقت کو ناپنے کا ایک ہی معیار ہوگا۔

لاشعور میں جو خیالات دبائے جاتے ہیں وہ اکثر اوقات ایسی گندی اور ناپسندیدہ خواہشات ہوتی ہیں جو خاندان اور سماج کے خوف سے پوری نہیں کی جاسکتیں۔ مثلاً کسی کے اندر اپنی بہن یا لڑکی کے ساتھ جنسی جذبہ پیدا ہو (Frued) تو وہ اس خیال سے اسے دبا دیتا ہے کہ اسے ظاہر کرنا رسوائی کا باعث ہوگا، کسی کو قتل کرنے کا خیال ہو تو آدمی اس کو اس ڈر سے اپنے ذہن میں دفن کردیتا ہے کہ اس کو سزا ملے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ گویا لاشعور میں دبی ہوئی خواہشیں اکثر اوقات برائیاں ہوتی ہیں، جو ماحول کے خوف سے بروئے کار نہیں آسکیں تھیں۔ اب اگر ایسے شخص میں ذہنی اختلال (Mental Disorder) پیدا ہو اور اس کا لاشعور ان کو ظاہر کرنا شروع کردے تو اس سے وہی برے جذبات اور غلط خواہشیں اس کی زبان سے نکلیں گی، جو اس کے لاشعور میں بھری ہوئی تھیں۔ ایسا آدمی شر کا تو پرچارک ہوسکتا ہے خیر کا نہیں۔ اس کے برعکس انبیاء کی زبان سے جس مذہب کا ظہور ہوا ہے، وہ سرتا سر خیر اور پاکیزہ ہے۔ یہ کلام اتنا پاکیزہ اور خیر کا اتنا اعلیٰ نمونہ ہے کہ اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی سوائے انبیاء کے کلام کے۔ یہی نہیں بلکہ کلام انبیاء میں اتنی کشش ہوتی ہے کہ وہی سماج جس کے خوف سے انہوں نے کبھی اپنے خیالات اپنے ذہن میں چھپائے تھے، وہ اس پر دل وجان سے فریفتہ ہوجاتا ہے۔ صدیاں گذر جاتی ہیں پھر بھی وہ انہیں نہیں چھوڑتا۔

تاریخ (History)

تاریخ یا سماج سے استدلال کرنے والوں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ مذہب کا مطالعہ ایک مفروضی مسئلہ (Objective Problem) کے طور پر کرتے ہیں دیکھو (Julian Huxley,The man in the modern world, P. 129) یعنی مذہب کے نام سے جو کچھ تاریخ میں کبھی پایا جاتا رہا ہے، ان سب کو مذہب کے اجزا سمجھ کر یکساں حیثیت سے جمع کر لیتے ہیں، پھر ان کی روشنی میں مذہب کے بارے میں رائے قائم کرتے ہیں، اس وجہ سے شروع سے ہی ان کی پوزیشن غلط ہوجاتی ہے۔

مذہب اپنی ذات میں ایک حقیقت ہے جس کو سماج اپنے ارادے سے قبول کرتا ہے یا نہیں کرتا یا ناقص شکل میں کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے اصولی طرح تو یہ ہمیشہ یکساں رہتا ہے لیکن سماج کی ہیئت کے اعتبار سے اس کی شکلیں مختلف ہوجاتی ہیں۔ اس لئے سماج کے اندر مروج مذاہب کی یکساں فہرست بندی کرکے ہم مذہب کو سمجھ نہیں سکتے۔ مثلاً جمہوریت یہ ایک مخصوص سیاسی معیار کا نام ہے، اور صرف اس رویہ کو جمہوری کہا جائے گا جو حقیقتاً جمہوری ہو، نہ کہ جس کے نام کے ساتھ جمہوری، لگا ہو وہ سب جمہوری ہوں گے۔ امریکی جمہوریت، روسی جمہوریت، چین کی جمہوریت، ہندوستان کی جمہوریت پاکستان کی جمہوریت بنگلہ دیش کی جمہوریت یہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

اسی طرح مذاہب ہیں۔ اس کے بعد جب ان سارے مشاہدات کو ارتقائی حالات میں رکھ کر دیکھا جائے گا تو یہ اور زیادہ بے معنی ہوجائے گا۔

یہ حضرات یہ کرتے ہیں کہ ان تمام چیزوں کو جمع کر لیتے ہیں جو کبھی مذہب کے نام سے منسوب رہی ہیں اور پھر اپنی مرضی کے مطابق ان کے درمیان ایک ارتقائی ترتیب قائم کر لیتے ہیں، جس میں ان تمام پہلوؤں کو نظر انداز کردیتے ہیں جن سے ان کی ارتقائی ترتیب بگڑنے کا اندیشہ ہوتا ہو۔ مثلاً علم انسانیات (Ontology) اور علم سماجیات (Sociology) کے ماہرین نے زبردست مطالعہ اور تحقیق کے بعد یہ ''دریافت'' کیا ہے کہ خدا کا تصور کئی خداؤں سے شروع ہوا اور بتدریج ترقی کرتے کرتے ایک خدا تک پہنچا، لیکن یہ ترقی ان کے نزدیک الٹی ہوئی ہے۔ مگر ''ایک خدا'' کے عقیدے نے قدرتی طور پر تمام دوسرے خداؤں اور ان کے ماننے والوں کو باطل ٹھہرایا اور برتر مذہب (Higher Religion) کا تصور پیدا کیا جس کی وجہ سے قوموں اور گروہوں میں کبھی ختم نہ ہونے والی جنگیں شروع ہوگئیں۔ یہ سب ارتقائی قانون کی وجہ سے ہوا۔ (The Man in the moderm world, P.112)

جواب: مگر ارتقائی ترتیب میں اصل واقعہ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، کیونکہ معلوم تاریخ کے مطابق سب سے پہلے پیغمبر حضرت نوحؑ تھے۔ ان کی دعوت کے متعلق ثابت ہوا ہے کہ وہ ایک خدا کی دعوت تھی۔ علاوہ از ایں زیادہ خداؤں (Polytheism) کا مطلب بھی مطلق تعدد نہیں۔ دنیا میں کبھی بھی کوئی قوم ایسی نہیں گذری جو بیک وقت بہت سارے خداؤں کو یکساں طور پر مانتی ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ایک بڑے خدا کو مانتے ہوئے اس کے مقربین کو ذیلی خداؤں کی حیثیت سے مانتی ہو۔ یعنی وہ بھی ایک خدا کو ہی بڑا مانتے ہیں۔ شرک کے ساتھ ہمیشہ ''خدائے خداء گان'' کا تصور پایا جاتا رہا ہے۔ لہٰذا ''ارتقائی مذہب'' ایک بے دلیل اور بے اصل بات ہے۔

مارکسی نظریۂ تاریخ

مارکسی نظریۂ تاریخ اور بھی زیادہ لغو (Absurd) ہے۔ یہ نظریہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ اقتصادی حالات ہی وہ اصل عامل ہیں جو انسان کی تعمیر وتشکیل کرتے ہیں۔ مذہب جس زمانے میں پیدا ہوا وہ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کا زمانہ تھا، چونکہ جاگیرداری اور سرمایہ داری استحصال اور لوٹ گھسوٹ کا نظام ہے اس لئے اس کے درمیان پیدا ہونے والے اخلاقی ومذہبی تصورات بھی یقینی طور پر اپنے ماحول ہی کا عکس ہوں گے، وہ لوٹ گھسوٹ کے نظریات ہوں گے۔ مگر یہ بات اور یہ نظریہ علمی حیثیت سے کوئی وزن نہیں رکھتا اور نہ ہی تجربہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔

یہ نظریہ انسانی ارادہ کی بالکلیہ نفی کردیتا ہے اور اس کو صرف معاشی حالات کی پیداوار قرار دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی اپنی کوئی ہستی ہی نہیں۔ آدمی فقط اپنے ماحول کے کارخانے میں ڈھل ڈھل کر نکلتا ہے، وہ الگ سے سوچ ہی نہیں سکتا، نہ ہی الگ سے کوئی کام کرتا ہے، بلکہ جو کچھ سوچتا یا کرتا ہے جو وہ ماحول یا معاشی حالات سے پاتا ہے۔ یعنی جو سوچتا ہے وہی کرتا ہے، جو کرتا ہے وہی سوچتا ہے۔

اگر یہ سچ ہے، تو مارکس جو خود بھی ''سرمایہ دارانہ نظام'' کے اندر پیدا ہوا تھا، اس کے لئے یہ کس طرح ممکن ہوا کہ وہ اپنے معاشی حالات کے خلاف سوچ سکے۔ کیا اس نے زمین کا مطالعہ کسی اور سیارے پر جاکر کیا تھا؟ اگر مذہب کو پیدا کرنے والا وقت کا اقتصادی نظام ہے تو آخر مارکسزم بھی وقت کے اقتصادی نظام کی پیداوار ہی تو ہے۔ مذہب کے لئے جو حیثیت مارکسزم مانتا ہے وہی حیثیت وہ اپنے لئے کیوں نہیں مانتا؟ حقیقت یہ

ہے کہ یہ نظریہ ناقابل یقین حد تک لغو ہے، اس کے پیچھے کوئی علمی وعقلی دلیل موجود نہیں ہے۔

تجربہ نے بھی اس نظریۂ کو غلط ثابت کیا ہے۔ روس میں تقریبا پون صدی (۷۵ سال) اس نظریہ کا مکمل تسلط رہا۔ لیکن اسٹالن کے مرنے کے بعد خود روسی لیڈروں کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے کہ اسٹالن کے دور میں روس کے اندر ظلم اور جبر ہوتا رہا اور عوام کا بری طرح استحصال کیا جاتا رہا۔ روسی پارٹی کی بیسویں کانگریس فروری سنہ۱۹۵۶ء میں اسٹالن کے مظالم کا انکشاف بڑے درد انگیز ماحول میں کیا گیا۔۱۹۶۴ء میں خروشیف کو برطرف کیا گیا اور دنیا کے سامنے اس کے کرتوت بھی واشگاف ہوئے۔ اس پون صدی کے تجربات سے کیا ثابت ہوا کہ اس نظرئے نے بھی انسانی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اگر انسانی ذہن، پیداوار کا تابع ہوتا تو اسی کے مطابق خیالات پیدا ہوتے اور پھر اشتراکی حکومت میں استحصالی اور ظالمانہ ذہنیت یقینی طور پر پیدا نہ ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کی تمام دلیلیں مذہب کے خلاف Scientific Sophism یعنی علمی سوفسط کے سوا کچھ بھی نہیں۔

کارل مارکس نے مارکسی انقلاب کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے بتایا ہے، سو وہ یہ ہے کہ جس طرح، ایک کائنات گیر قانونِ کشش سے ستارے اور سیارے حرکت کر رہے ہیں، اسی طرح کچھ ناقابل تغیر تاریخی قوانین بھی ہیں جو سماجی تبدیلیوں کا سبب بنتے ہیں۔ یہ قوانین مسلسل طور پر اپنا کام کررہے ہیں۔ اور اسی کے مطابق انسانی زندگی میں انقلاب آتے ہیں۔ مگر یہ فلسفہ بیان کرنے کے ساتھ ہی اس نے یہ نعرہ بھی لگایا کہ ''دنیا کے مزدورو! ایک ہوجاؤ!''

ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اگر سماجی تبدیلیوں کا کوئی ناگزیر تاریخی قانون ہے تو سیاسی جدوجہد کی ضرورت نہیں اور اگر سیاسی جدوجہد کے ذریعے انقلاب آتا ہے تو پھر ناگزیر تاریخی قانون کی کوئی اہمیت نہیں۔

علم حیاتیات اور علم طبقات الارض (GEOLOGY & Biology)

علم حیاتیات میں ڈارون کی کتاب ''اصل الانواع'' (The Origin of species) نے ایک عرصہ تک دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا رکھا کہ انسان، جانداروں کی ادنیٰ انواع سے ارتقاء کرکے بندر بنا اور پھر انسان بن گیا۔ ڈارون کے زمانے میں ہی دیگر ماہرین حیاتیات نے ان سے دیگر حیوانوں کے ساتھ ساتھ بندر اور انسان کے درمیانی شکل رکھنے والے جانوروں کا ثبوت مانگا تو وہ اس کا جواب دے نہ سکے۔

جواب میں انہوں نے کہا کہ آئندہ علم طبقات الارض کے ماہرین جب متحجرات (Fossils) سامنے لائیں گے تو یہ درمیانی گمشدہ کڑیاں (Missing Limes) بھی ظاہر ہوجائیں گی۔ لیکن گذشتہ صدی کے دوران ایسا نہ ہوسکا۔ سنہ۷۰-۱۹۶۰ع کے دوران اور بعد میں ڈارون کی تھیوری پر مزید تحقیق ہوئی۔ نتیجتًا کئی سائنسدانوں نے اسے غلط ثابت کر دیا۔ ڈارون کی ۲۰۰ ویں برسی پر سیمینار میں کئی محققین نہ بتایا کہ (DNA) ٹیسٹ نے اس تھیوری کو غیر ثابت شدہ ظاہر کیا ہے۔ بندر کے کروموسوم۔

اور انسان کے کروموسومز میں 98% یکسانیت نہیں ہے۔

Fifteen proofs that disprove Darwin on 200th anniversary of his birth. Ape and human chromosomes are not identical upto 98% according to DNA Test. Websiten.

اس پر سر آرتھر کیتھ کو کہنا پڑا کہ:

Evoluttion is unproved and unprovable. (Islamic Thovght, Dec.1961.)

یعنی نظریہ ارتقاء ایک غیر ثابت شدہ نظریہ ہے جسے کبھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

6 فلسفہ Philosoply

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اگر تمام اشیاء کا خالق خدا ہے تو خدا کا خالق کون ہے؟ اس سوال میں نقص یہ ہے کہ خدا اور کائنات کو ایک ہی سطح پر رکھا گیا ہے۔ یعنی فرض کر لیا گیا

ہے کہ کائنات اور خدا ایک ہی جیسے ہیں۔ کائنات کے لئے جو چیزیں ضروری ہیں، خدا کے لئے بھی وہ چیزیں ضروری ہیں۔ اس طرح بات کائنات کے خالق اور خالق کے خالق کی ضرورت پر جا پہنچتی ہے۔ لیکن یہ بات تب صحیح ہوتی جب یہ ثابت ہوجاتا کہ کائنات اور خدا دونوں ایک جیسے ہیں۔ ان دونوں کی حالت اور نوعیت میں کوئی فرق نہیں۔ اس سوال کی غلطی واضح کرنے کے لئے اس سوال پر غور کریں کہ ساری چیزیں زمین پر رکھی ہوئی ہیں تو زمین کس چیز پر رکھی ہوئی ہے؟ اس سوال میں بھی زمین اور اس پر موجود تمام چیزوں کو ایک ہی جیسا سمجھ لیا گیا ہے۔ تمام اشیاء کا کسی طور پر زمین سے تعلق ہے، لیکن زمین اور تمام اشیاء کو ایک جیسا سمجھنے میں بڑا فرق ہے۔ تو پھر خالق اور مخلوق کے درمیان بھی ضرور فرق ہونا چاہئے۔ یہ دونوں ایک جیسی چیزیں نہیں۔ ایسا سوال کرنے والے کائنات اور اس کی پیدائش پر غور نہیں کرتے۔ کسی چیز کے ''پیدا'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز پہلے موجود نہیں تھی، بعد میں وجود میں آئی ہے۔ تو اس سوال کا پہلا حصہ ''اگر خدا کائنات کا خالق ہے تو'' یعنی وہ کائنات کو مخلوق تسلیم کرتے ہیں، ورنہ کائنات کو ازلی ابدی ماننا پڑے گا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کائنات کو بے خدا سمجھا جائے۔

''خدا کائنات کا خالق ہے'' اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا ایسی ہستی کا نام ہے جو پوری کائنات اور آج تک تمام پیدا ہونے والی مخلوق کا خالق ہے۔ جب کائنات موجود نہ تھی، تب بھی خدا موجود تھا، اس نے اپنی خاص قدرت سے دنیا کو پیدا کیا۔ بالفاظ دیگر خدا کائنات سے بلند وبرتر ہے۔ وہ مخلوق نہیں، خالق ہے۔ درحقیقت یہ کائنات نہ تو ازلی ہے اور نہ ابدی، یہ پیدا کی گئی ہے۔ لہذا اس کے خالق کو ماننا ضروری ہے، جبکہ خدا ازلی وابدی ہستی ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ مخلوق نہیں ہے کہ جس کو کسی خالق کی ضرورت پیش آئے۔ خدا خود خالق ہے، لہذا اس کے بارے میں یہ سوال غیر ضروری ہے کہ اسے کس نے پیدا کیا؟ یہ تو مخلوق ہی ہوتی ہے، جس کو خالق کی ضرورت ہوتی ہے۔ خدا کے بارے ایسا سوال کرنا بے عقلی کی بات ہے۔

اس بات کی مزید وضاحت اس طرح ہوسکتی ہے۔

سوال اس طرح کیا جاتا ہے کہ اگر تمام چیزوں کو پیدا کرنے والا خدا ہے تو خدا کو کس نے پیدا کیا ہے؟

ایک طرف یہ کہنا کہ خدا تمام مخلوق سے الگ، بلند و برتر ہے۔ پیدا نہیں ہوا اور دوسرے ہی لمحے یہ سوال کرنا کہ اسے کس نے پیدا کیا ہے؟ یہ سوال کس قدر مضحکہ خیز اور تعجب انگیز ہے، اس سے بھی زیادہ تحیر کی بات یہ ہے کہ الحاد وبیدینی نے اپنی عمارت کس قدر غلط سوال پر تعمیر کی ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ وہ خدا کو ازلی وابدی مانتا ہی نہیں اور کائنات کی طرح خدا بھی مخلوق ہے اور اس کا کوئی خالق نہیں، تو پھر تو یہ سوال بالکل فضول ولایعنی ہے۔ کیونکہ اگر کسی کو خدا کا خالق تسلیم کیا جائے گا تو پھر وہ یہ سوال کرے گا، آخر اس خدا کے خالق کو کس نے پیدا کیا۔ اور پھر سوالات کا یہ سلسلہ تب تک چلتا رہے گا، جب تک کہ آپ کسی کو ازلی وابدی خالق تسلیم نہ کر لیں۔ ہم اسی ہستی کو خدا کہتے ہیں۔ کسی بھی مخلوق کو، چاہے وہ کسی دوسری چیز کے پیدائش کا سبب بنی ہو، خدا کی حیثیت نہیں دیتے۔

پوری بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آپ کسی نہ کسی ہستی کو ازلی وابدی اور قائم بالذات (جو اپنی طاقت سے ازخود قائم ہو) ماننے پر مجبور ہیں۔ آپ یا تو خدا کو ازلی ابدی اور قائم بالذات کی حیثیت سے تسلیم کریں یا پھر یہی حیثیت کائنات کو دیں۔ خدا کو نہ ماننے والے ہی کائنات کو ازلی ابدی کہتے ہیں۔ اور اگلے ہی لمحے یہ لوگ خدا کو ازلی ابدی اور قائم بالذات کہتے ہیں۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ کائنات بھی مخلوق ہو اور خدا بھی مخلوق ہو۔ کسی چیز کے مخلوق ہونے کا مطلب ہے کہ وہ چیز پہلے موجود نہیں تھی، بعد میں پیدا ہوئی ہے۔ جب کائنات اور خدا دونوں مخلوق ہوں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ کوئی زمانہ ایسا بھی تھا کہ جب ان دونوں میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا۔ اگر اس بات کو صحیح مان لیا جائے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دنیا کہاں سے نکل آئی؟۔ کوئی بھی چیز موجود نہ ہو اور کائنات ازخود پیدا ہوجائے، یہ تو ناممکن ہے۔ اب یا تو اس بات کو مانیں کہ دنیا میں کوئی چیز بھی نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اور اس کے سوا کو چارہ بھی نہیں کہ کہ یہ مانا جائے کہ کوئی ایسی ہستی موجود ہے جس کو کسی نے پیدا نہیں کیا ہے اور وہ موجود ہے۔ تیسری کوئی صورت نہیں۔ کوئی شخص جو خدا کا انکار کرتا ہے، بھلے کرلے، لیکن ایسے خدا کا جو ازلی، ابدی اور اپنی قوت

سے قائم ہو، کا انکار نہیں کر سکتا۔ لہذا اس سوال کی گنجائش نہیں ہے کہ اگر خدا ہے تو اس کا خالق کون ہے؟ کیسی تعجب انگیز بات ہے کہ خدا کو خدا تسلیم کرنے کے بعد فورا یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آخر اس کا خالق کون ہے۔ دوسری جانب حالت یہ ہے کہ خدا کا انکار کرنے کی صورت میں آپ فورا یقین کرتے ہیں کہ کائنات ازلی، ابدی اور خود بخود قائم ہے۔

سوال: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ:

اگر ہمیں کسی کو ازلی ابدی اور قائم بالذات ہستی کو ماننا ہی ہے تو پھر یہ حیثیت خدا کو دینے کی بجائے کائنات کو ہی کیوں نہ دیں۔ لیکن یہ تو بالکل ہی فرضی بات ہوگی، کیونکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ کائنات کو تخلیقی عمل کرنے والا مانا جائے۔ جدید سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مادہ فانی ہے، یہ نہ تو ازلی ہے نہ ابدی۔ سائنسدانوں نے یہ حساب لگا کر بتایا ہے کہ یہ کائنات اتنے ارب سال پہلے وجود میں آئی تھی۔ اس سے پہلے موجود نہیں تھی۔ مادہ بجلی کے ذرات سے بنا ہوا ہے، جس کا مادی وجود نہ ہونے کے برابر ہے، یہ توانائی کی مختلف صورتیں ہیں۔ اور یہ کہ ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے کہ گیس پانی وغیرہ کا بھی وجود نہ تھا۔ توانائی کا ایک وسیع ذخیرہ تھا، جس نے بعد میں ایک مخصوص زمانہ میں مادی شکل اختیار کی۔ سائنس بتاتی ہے کہ اتنے کہ اتنے ارب سال پہلے ایک بڑا دھماکہ (Big Bang) ہوا تھا، جس کے نتیجہ میں اس ذخیرہ نے مادے کی صورت اختیار کی۔

دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں سوال فقط کائنات کے پیدا ہونے کا ہی نہیں، بلکہ یہ کہ کائنات میں جو منظّم منصوبہ بندی اور حکمت (Wisdom Imtelligence) نظر آتی ہے وہ کیوں ہے؟ کیا اس سے ایک علیم وخبیر ہستی کے شواہد نہیں ملتے۔ یا یہاں بھی تم کہو گے کہ یہ سب اندھے بہرے، بے بس اور بے سمجھ مادہ کا کرشمہ ہے؟ کیا مادہ میں تمہیں کوئی شعور، عقل، منصوبہ بندی اور تنظیم نظر آتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر کائنات میں تنظیم ومنصوبہ بندی کے سلسلہ میں خدا کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔